© rasailojaraid.com

حضرت العلام مولانا حافظ محمد صاحب گوندلوی

دوام حدیث

احادیثِ صحیحہ پر اعتراضات

متن اور سند دونوں پر

صحیح بخاری پر چوتھا اعتراض

مقام حدیث ص ۲۹۸ میں ہے:۔

"حافظ ابن حجر روایتِ معراج کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ثابتؓ کی روایت میں جو "فربطتہ بالحلقۃ" (کہ میں نے براق کو حلقہ سے باندھ دیا) آیا ہے حضرت حذیفہ اس کا انکار کرتے ہیں"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت حذیفہؓ کے انکار کو محدثین نے تسلیم نہیں کیا۔ بیہقی سے حافظ ابن حجر نے نقل کیا ہے "المثبت مقدم علی النافی" اور حضرت حذیفہ کا رد کرنا صرف اپنے خیال کی بنا پر تھا۔ مگر بعض ملکوتی باتیں قیاس سے بالاتر ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی ایک آدمی قرآن کی آیت غلط پڑھ جاتا ہے۔ حضرت حذیفہ کی بات بھی اسی قسم کی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض وقت بعض باتیں بادی الرائی میں غلط معلوم ہوتی ہیں پھر نظر غائر سے ان کی صحت معلوم ہو جاتی ہے۔ حضرت حذیفہ کا انکار اسی بنا پر تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس براق کو مسخر کیا تھا تو باندھنے کی کیا ضرورت تھی حالانکہ تسخیر ظاہری اسباب کے منافی نہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صحیح بخاری پر پانچواں اعتراض

مقام حدیث ص ۲۹۸ میں ہے کہ:۔

"بخاری کی روایت جس کا مضمون یہ ہے کہ حضرت ابراہیم اپنے والد آزر سے قیامت کے دن اس حال میں ملیں گے کہ آزر کے چہرے پر تارکول ملا ہوا ہوگا"

نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:۔

اس خبر کی صحت میں نظر ہے اور دلیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا پس جب اللہ تعالیٰ ان سے وعدہ کر چکا ہے کہ وہ قیامت کے دن ان کے باپ آزر کو رسوا نہیں کرے گا تو پھر اس کے خلاف کس طرح کر سکتا ہے"

جواب: وعدہ صرف اس بات کا تھا کہ ابراہیم کو اللہ تعالیٰ رسوا نہ کریں گے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے معذب ہونے کو بھی رسوائی کا فرد سمجھ لیا۔ اس بنا پر شبہ رفع کرنے کے لیے سوال کیا تو اس کا جواب ملا کہ میرے وعدہ میں کافر داخل نہیں نیز مومن اور کافر میں اب کوئی تعلق نہیں وہاں کوئی نسبی تعلق نہیں ہوگا۔ بس ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے وعدہ میں یقین تھا۔ اگر اس کے متعلق یہ شبہ تھا کہ یہ بھی اس کا فرد ہے یا نہیں۔ بس اس غلطی اور شبہ کو دفع کر دیا گیا۔ اسماعیلی کا یہ اعتراض اگرچہ غلط تھا مگر اتنا تو پتہ چلتا ہے کہ محدثین محض سند ہی کی طرف التفات نہیں رکھتے تھے بلکہ درایت کا بھی خیال کرتے تھے اور حدیثیں جمع کرنے والے بھی اس امر کا خیال رکھتے تھے مگر ان کی تحقیق میں جو حدیث از روئے سند صحیح ہوتی تھی۔ اس پر کوئی عقلی اعتراض ہو سکتا تھا۔

چھٹی روایت قابلِ اعتراض

"حضرت ابوذر کہتے ہیں کہ ایک روز غروب آفتاب کے وقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسجد میں بیٹھا ہوا تھا کہ حضورؐ نے فرمایا: ابوذر تم جانتے ہو کہ سورج کہاں ڈوبتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ خدا اور اس کا رسول ہی خوب واقف ہیں۔ فرمایا یہ جا کر عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے۔ یہی مطلب ہے خدا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے اس قول کا وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا (بخاری کتاب التفسیر)
(مقام حدیث جلد ۱ صـ۲۷)

جواب: اس حدیث میں سوال کی یہ صورت ہے کہ:-

۱۔ سورج کا غروب ہونا اس امر سے عبارت ہے کہ زمین کی حرکت کی وجہ سے ہمارے مقابل سے چھپ جاتا ہے مگر یہ جگہ سے غائب نہیں ہوتا اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سورج بالکل ہی غائب ہوجاتا ہے۔

۲۔ سورج جب غائب ہوتا ہے تو عرش کے نیچے جاکر سجدہ کرتا ہے یعنی عرش کے نیچے جاکر سجدہ کرتا ہے یعنی عرش کے نیچے جاتا ہے۔ حالانکہ سورج مجموعہ زمین کی طرف اپنی نسبت کو نہیں چھوڑتا بلکہ زمین کی دوسری جانب ہوتا ہے۔

حدیث کے ترجمہ میں جو سوال کو ان لفظوں میں ذکر کیا ہے کہ "سورج کہاں ڈوبتا ہے" یہ حدیث کا غلط ترجمہ ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لابی ذر حین غربت الشمس اتدری این تذھب ؟

کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو ذر کو سورج کے غروب ہونے کے وقت فرمایا کہ سورج کہاں جا رہا ہے، اس سے تم واقف ہو ؟

یعنی سورج کے ڈوبنے کی جگہ سے سوال نہیں کہ کہاں ڈوبتا ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ سورج اب کہاں جارہا ہے اور سورج کی جانب آنے سے مطلب اس کا عرفی معنے ہے اگرچہ زمین کی حرکت کی بنا پر ہو۔ کیونکہ عرف میں آمد و رفت چڑھنے، ڈوبنے کو سورج کی طرف ہی منسوب کرتے ہیں خواہ آج کل نظام شمسی کی ہیئات سے پوری واقفیت بھی رکھتے ہوں جیسے جو لوگ گاڑی پر سوار ہوتے ہیں یہی کہتے سنے جاتے ہیں کہ فلاں سٹیشن آگیا ہے۔ اگرچہ حقیقت میں گاڑی پہنچتی ہے۔ آنحضرت نے بھی عرفی طور پر سوال کیا۔ سورج جو ہماری نظروں سے حرکت کرتا کرتا نظر سے اوجھل ہوگیا، اب کدھر جا رہا ہے تو ابوذر نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اللہ اور رسول زیادہ جانتے ہیں،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو آپ نے فرمایا جیسا پہلے چلتا ہوا نظر آتا تھا، اسی طرح اب بھی چل رہا ہے یہاں تک کہ چلتا چلتا عرش کے نیچے یعنے بہت دور پہنچ جاتا ہے۔ کیونکہ عرش سے مراد وہ شے ہے جو عالم مثال میں ایک سالک کو تخت کی طرح نظر آتی ہے اور زمین کی جس طرف وہ ہوتا ہے ہمیشہ اس کو اپنے سر کی طرف اقصا عالم میں محسوس کرتا ہے۔ پس جب سورج غروب کے بعد چلتا چلتا اس عرش محسوس سے دور ہوتا جائے گا تو اس کی آخری دوری آدھی رات کو ہوگی۔ اسی جگہ کو تحت العرش کہا ہے۔ یعنے وہ عرش جو سالک کو اقصا عالم میں اپنے سر کی طرف نظر آتا ہے۔ جب سورج سالک کی نظروں کے سامنے تھا تو اس وقت عرش سے زیادہ قریب تھا مگر غروب کے بعد دور ہوتا ہوتا آدھی رات کو تحت العرش جا پہنچا یعنے انتہائی دوری کے مقام میں چلا گیا۔ اب اس کے بعد پھر مشرق کی طرف اس کی حرکت ہوگی۔ پھر افق سے اوپر آکر طلوع کرے گا اور تحت العرش کو آدھی رات کے بعد چھوڑ دے گا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ صاحب کشف کے بغیر دوسرا اس کو محسوس نہیں کرتا اس لیے وہ نہیں سمجھ سکتا۔ اس واسطے ابوذر نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے یہی کہا کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔

۲۔ سورج کا سجدہ کرنا اس امر سے عبارت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرے اور وہ ہر وقت کر رہا ہے۔ حدیث کا یہ مطلب ہے کہ سورج جا رہا ہے اور یہی اس کا سجدہ ہے۔ اس حرکت کی بنا پر عرش سے جو دوری پیدا ہو رہی ہے یہ اس طرح جاری رہے گی کہ آدھی رات ہو جائے پھر تحت العرش جا کر سجدہ کرے یعنی وہاں پہنچ جائے پھر وہاں تحت العرش سے مشرقی افق آئے گا اور عرش محسوس کے قریب ہوتا جائے گا یہاں تک کہ نصف النہار یعنی زوال کے وقت عرش محسوس کے زیادہ قریب ہو جائے گا۔ پھر نیچے ہوتا ہوتا غروب کے بعد اسی طرح دور ہوتا جائے گا کہ تحت العرش پہنچ جائے اور سجدہ کرتا کرتا تحت العرش جا سجدہ کرے۔ قرآن میں ہے:۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ الخ (الحج)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اے پیغمبر تو نے دیکھا نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے آسمان و زمین کا ہر شخص سجدہ کرتا ہے اور سورج چاند اور تارے بھی سجدہ کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ اور جواب بھی ہیں مگر سمجھنے کے لیے یہی کافی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام کا ذکر خاص اس لیے فرمایا ہے کہ قیامت کے قریب جب سورج مغرب کی طرف سے چڑھتا ہوا معلوم ہوگا۔ اسی مقام سے (یعنی افق عرب کے اعتبار سے آدھی رات کے بعد) واپس ہوگا یعنی اس وقت زمین کی الٹی حرکت ہوگی۔ ایک دو روز اس طرح ہوگا پھر سابق کی طرح حرکت جاری رہے گی۔ اور آدھی رات کے مقام کی طرف جانے کو قرآن نے ان لفظوں میں بیان کیا کہ سورج کی یہ حرکت محسوس (خواہ زمین کی حرکت کی بنا پر ہی ہو) تحت العرش کی طرف ہے۔ اس مقام کو قرارگاہ اس لیے کہا ہے کہ سورج کی رجعت اسی مقام سے ہوگی مگر افق عرب کے اعتبار سے اس جگہ سورج کی عمودی یا وہ حرکت جو سائنس سے نظام شمسی کو لے کر جارہا ہے، مراد نہیں۔ کیونکہ یہ پیغمبر کے علم کے ساتھ مخصوص نہیں بخلاف اس امر کے جس میں نے ذکر کیا ہے وہ پیغمبر کے علم سے مناسب ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق سالک کے محسوسات سے اور آئندہ زمانے کے متعلق ایک پیش گوئی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے تفہیمات میں اس مثالی عرش کا ذکر کیا ہے جو عرش کے اوپر ہے۔

ساتویں حدیث قابل اعتراض

"حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ حضور اقدس نے ایک بار ارشاد فرمایا کہ دوزخ نے اپنے پروردگار سے شکایت کی اور عرض کیا کہ الٰہی میرا بعض حصہ بعض کو کھاتے جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے اس کو دو سانس لینے کا حکم دیا۔ ایک سانس موسم سرما میں اور ایک سانس موسم گرما میں۔ چنانچہ بہت سخت گرمی اس کی وجہ سے ہوتی ہے اور بہت سخت سردی بھی اس کی وجہ سے" (بخاری شریف)

اس پر اعتراض یہ ہے کہ گرمی اور سردی تو زمین کی دوری حرکت کی وجہ سے ہے مگر حدیث میں دوزخ کو سبب قرار دیا گیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جواب :۔ اس حدیث کے متعلق اگرچہ بہت سے اقوال ہیں مگر یہاں صرف دو پر اکتفا کرتے ہیں :۔

۱۔ اس حدیث میں تمثیل ہے مطلب صرف یہ ہے کہ گرمی تکلیف دہ چیز ہے۔ باقی قصہ دوزخ کی شکایت اور سوال وجواب اور اذن وغیرہ سب اس تمثیل کا بیان ہے۔ اس تمثیل سے یہ مقصود ہے کہ گرمی سخت تکلیف دہ امر ہے گویا کہ جہنم کے سانس کا اثر ہے۔ ایسا ہے جیساکہ جہنم نے تنگ آکر اللہ تعالیٰ سے گرمی خارج کرنے کی اجازت لی ہے۔ اس قسم کی تمثیلات قرآن مجید میں بھی ہیں جیساکہ فرمایا :۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ
يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ (سورہ ۷۲ احزاب)

ہم نے آسمان وزمین اور پہاڑوں پر امانت پیش کی تو انہوں نے اٹھانے سے انکار کر دیا اور ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔

اس آیت میں بطور تمثیل ذمہ داری قبول کرنے کی اہمیت بیان کی گئی ہے کہ ذمہ داری کا بوجھ بہت سخت ہے۔ اتنا سخت کہ گویا زمین وآسمان اور پہاڑ اس کے اٹھانے سے عاجز آگئے۔ یہ مطلب نہیں کہ ان کو ذمہ دار بنانے کے لیے کہا گیا تو وہ عاصی ہو گئے اور انکار کرنے لگے۔ اس قسم کی دوسری آیت یہ ہے :۔

ثُمَّ اسْتَوٰى إِلَى السَّمَاءِ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا
قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ (سورہ حم سجدہ)

اللہ تعالیٰ نے زمین بنا کر آسمان کی طرف قصد کیا تو زمین اور آسمان کو کہا تم دونوں آؤ خوشی سے یا ناخوشی سے۔ وہ دونوں بولے کہ ہم خوشی سے آتے ہیں

اس آیت کا مطلب بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ایسا ہے کہ اس سے کوئی بڑی سے بڑی شئے بھی نہیں رکتی۔ یہ ایک تمثیل ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ کوئی سوال وجواب ہوا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے اختیار اور قہر کا ذکر ہے کہ ہر چیز میں اس کا حکم نافذ ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ حدیث تمثیل نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عالم شہادت اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عالم مثال کا آپس میں تعلق ہے پس جو مخالف کیفیت ہے۔ اس کا منبع اور جہنم کا منبع ایک ہی ہے۔ یعنی عالم مثال میں ایک منبع (جیسے دریا ہوتا ہے) موجود ہے اور جہنم اور اس جہاں کی ہر مخالف کیفیت جو بلحاظ درجے یا اصل کے انسان کے لیے مضر ہو اس کی زیادتی یا اس کا اصل اسی منبع سے پھوٹ رہے ہیں جو جہنم کا منبع ہے اور یہ اس امر کے منافی نہیں کہ گرمی تو سورج سے آرہی ہے کیونکہ عالم شہادت اور عالم مثال میں ایک ربط ہے۔ ایک عالم کی چیزیں دوسرے عالم کی چیزوں کا عکس ہوتی ہیں۔ پس جہنم اور کیفیاتِ مخالفہ کا منبع چونکہ ایک ہی ہے اس لیے ان کیفیات کی نسبت جہنم کی طرف کی گئی۔ جیساکہ ایک دریا سے دو نہریں نکلیں تو ایک نہر کے پانی کو دوسری نہر کی طرف نسبت کر دیتے ہیں۔ کیونکہ منبع ایک ہی ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ایک نہر کے پانی کو بند کرنے سے دوسری نہر میں پانی زیادہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب منبع سے اس جہان میں کیفیات مخالفہ کا ظہور رہا تو دوسری طرف جہنم میں کمی ہو گئی۔ اگرچہ وہ زیادتی عالم شہادت میں حرکت دوری اور سورج کے قریب وبعید لانے کی وجہ سے ہے اور حدیث میں یہ بھی ہم کو سورج کی گرمی سے پیدا کیا۔ ایک شے کے مختلف اسباب ہوتے ہیں۔ ایک ظاہر ایک مثالی۔ ایک مثال سے پھر اوپر۔ پس گرمی کا ظاہری سبب سورج ہے اور مثالی سبب جہنم اور ہر کیفیت مخالفت کا منبع اور اصل مسبب الاسباب اللہ تعالیٰ۔ ظاہری اسباب کو تو لوگ جانتے ہیں۔ اس واسطے شریعت میں بسا اوقات باطنی اسباب کا ذکر ہوتا ہے اور کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کی جاتی ہے۔

منکرینِ حدیث کے ہاں قابلِ اعتراض آٹھویں حدیث

"حضرت ابن عباس کہتے ہیں حضور اقدس نے ارشاد فرمایا تم حشر کے دن ننگے پاؤں ننگے سر بغیر ختنہ کیے اٹھو گے۔ اس کے ثبوت میں حضور نے یہ آیت تلاوت فرمائی كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ وَعْدًا عَلَيْنَا إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ

اس کے بعد حضور نے فرمایا سب سے پہلے حضرت ابراہیم کو لباس پہنایا جائے گا۔ اس روز میرے بعض صحابیوں کو بائیں جانب والی قطار کی طرف کھینچا جائے گا

© rasailojaraid:com

© rasailojaraid.com

(یعنی دوزخیوں کی قطار میں) میں کہوں گا یہ تو میرے صحابی ہیں۔ کھینچنے والا کہے گا کہ آپ کے جدا ہو جانے کے بعد یہ لوگ ایڑیوں کے بل (اسلام سے) لوٹ گئے تھے۔ میں اس وقت وہی کہوں گا جو اس نیک بندے (عیسیٰ) نے کہا تھا وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَا دُمْتُ فِيهِمْ (یعنی جب تک میں ان میں رہا، بعد کا میں ذمہ دار نہیں) (بخاری ص۲۷۶)

اس حدیث کے بارے میں معترض نے اعتراض کی تفصیل نہیں کی۔ شاید اس کے دماغ میں کیا کچھ تھا۔ صرف چند لفظوں کا ترجمہ غلط کیا ہے۔ شاید وہی لفظ قابل اعتراض ہیں یا بعض جگہ کچھ اضافہ کر کے جو مطلب بگاڑا ہے۔ اس پر اعتراض ہے۔

۱۔ آنحضرتؐ کی تلاوت کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ آنحضرت نے یہ آیت ثبوت میں پڑھی۔

۲۔ حدیث میں جو لفظ اصحاب ساتھیوں کے معنی میں مستعمل ہے جو اصطلاحی معنے کے اعتبار سے صحابی اور ان لوگوں کو بھی شامل ہے جو بظاہر اسلام قبول کر چکے تھے۔ مگر معترض نے صحابی کے لفظ کے ساتھ تعبیر کر کے ایک معنی متعین کر دیا ہے۔

۳۔ اخیر میں شہداء کا معنے نگران کر کے اس کو قابل اعتراض بنا دیا ہے۔

پھر اعتراض کرتے ہیں کہ:۔

"اس تفسیر کو حضور کی طرف کیسے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ پھر روایت کا آخری حصہ تو صاف بتا رہا ہے کہ حضورؐ کے صحابہ کے دشمنوں کی طرف سے اس روایت کو وضع کیا گیا ہے" (ص۲۷۶)

جواب:۔ آخری اعتراض میں اس بات کو بھول گئے ہیں کہ صحابہ کے دشمن یہ حدیث بنا کر کہاں غائب ہو گئے۔ کیونکہ صحابہ کے دشمن دو گروہ ہیں۔ خارجی اور شیعہ۔ ان دونوں گروہوں سے اس قسم کی روایت لینے سے محدثین احتراز کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی روایت سے استشہاد نہیں کرتے۔ ہم پہلے مفصل بیان کر چکے ہیں کہ دین کی حفاظت کے لیے نقل کرتے وقت غیبی طور سے ایسے اسباب پیدا کر دیے تھے جن کے ہوتے ہوتے ایسی دسیسہ کاریوں کا پتہ چل جاتا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نوعیت حدیث قابل اعتراض

"مثلاً قرآن کریم میں ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ۭ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا

اے ایمان والو! ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے موسےٰ کو ایذاء دی سو اللہ تعالیٰ نے ان باتوں سے جو وہ لوگ کہتے تھے اسے بری کر دیا اور اللہ کے ہاں وہ بڑے آبرومند تھے......

اس آیت کی تفسیر میں حسب ذیل روایت ملتی ہے:۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں، حضور والا نے ارشاد فرمایا کہ موسےٰ نہایت باحیا اور ستر کو چھپانے والے تھے۔ چونکہ ان کے مزاج میں شرم تھی اس لیے کوئی ان کے حصہ بدن کو نہ دیکھ سکتا۔ لیکن بعض موذی بنی اسرائیل نے ان کو ایذاء پہنچائی اور کہنے لگے کہ یہ اس قدر پردہ صرف اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے بدن میں کوئی عیب ہے۔ برص ہے یا باد خایہ ہے یا کوئی اور مرض۔ اس لیے خدا تعالیٰ کا ارادہ ہوا کہ موسےٰ کو بری کر دے۔ چنانچہ ایک روز حضرت موسےٰ تنہائی میں غسل کرنے کھڑے ہوئے۔ کپڑے اتار کر پتھر پر رکھے اور غسل کرنے لگے۔ غسل سے فارغ ہو کر جب کپڑے لینے کے لیے بڑھے تو پتھر کپڑے لے کر بھاگا۔ موسےٰ لاٹھی لے کر پتھر کے پیچھے یہ کہتے ہوئے چلے "او پتھر میرے کپڑے"۔ یہاں تک کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت کے پاس تک پہنچ گئے۔ لوگوں نے ان کو برہنہ دیکھ لیا کہ بہتر ساخت کے آدمی ہیں۔ خدا تعالیٰ نے اس طرح ا بنی اسرائیل کی افترا بندی سے ان کو بری کر دیا۔ بالآخر پتھر رک گیا۔ موسےٰ نے اپنے کپڑے لے لیے اور پھر لاٹھی سے پتھر کو مارنے لگے۔ حضور نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے مذکورہ ذیل قول کا یہی مطلب ہے۔　(بخاری شریف)

ہم اس تفسیر کو کبھی حضور اقدس کی طرف منسوب نہیں کر سکتے" (مقام حدیث ص۲۷۸)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جواب :- اس مقام میں بھی معترض نے اپنے اعتراض سے لب کشائی نہیں فرمائی۔ کیونکہ حدیث میں بہت سی باتیں ہیں۔

۱۔ قوم کا اعتراض

۲۔ موسیٰ کا خلوت میں کپڑے اتار کر غسل کرنا۔

۳۔ پتھر کا کپڑے لے کر بھاگ جانا

۴۔ بنی اسرائیل کے پاس موسیٰ علیہ السلام کا پہنچ جانا۔

۵۔ پتھر کو مارنا

۱۔ بنی اسرائیل کے اعتراض میں کیا استفسار ہے۔ جو قوم موسیٰ علیہ السلام پر اعتراض کرنے کی عادی ہے۔ اس سے اس قسم کے اعتراض ہونا کوئی بعید نہیں۔

۲۔ اور خلوت میں نہانے پر بھی اعتراض نہیں، کیونکہ پردہ آدمیوں سے ہوتا ہے۔ جب انسان اکیلا ہو تو ضرورت کے لیے کپڑے اتارنے میں کوئی حرج نہیں۔

۳۔ پتھر کا کپڑے لے کر بھاگ جانا بھی کوئی مستبعد نہیں۔ زیادہ سے زیادہ اس میں یہی ہے کہ یہ امر خرق عادت ہے اور خرق عادت خصوصاً انبیاء کی نسبت کوئی بعید نہیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی سانپ بن جاتی ہے اور دوڑنے لگتی ہے تو پہلی دفعہ موسیٰ علیہ السلام بھی بھاگ کھڑے ہوئے جیسا کہ قرآن میں ہے۔ پس اس طرح ایک پتھر کا حرکت میں آجانا کیا مستبعد ہے۔

۴۔ بنی اسرائیل میں اس طرح پہنچ جانا۔ اوروں کا دیکھنا بھی کوئی مستبعد نہیں، نہ حیا اور مروت کے خلاف ہے کیونکہ یہ ان کا اختیاری معاملہ نہیں تھا۔ اور جو قوم ننگے ہونے کی عادی ہو ان کے نزدیک کبھی ایک دفعہ یہ کام ہونا کوئی شرم کا باعث نہیں ہوتا۔ قرآن مجید میں ہے کہ حضرت آدم اور آپ کی بیوی دونوں کا لباس اتر گیا۔

يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ...... (الاعراف)

ابلیس نے ان کا لباس اتار کر ان کی شرمگاہیں ان کو دکھا دیں وہ مارے شرم کے پتوں سے ستر چھپانے لگے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۵- اور موسیٰ علیہ السلام کا پتھر کو مارنا اس بنا پر تھا کہ اس سے یہ حرکت ایسی سرزد ہوئی جیسے ایک ذی العقل سے سرزد ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ انہوں نے یہ سمجھا ہو کہ اس پتھر میں کوئی شیطان حلول کر گیا جو اس کو لے آیا۔

یہ بیان تو ان لوگوں کے مذاق کے مطابق ہے جن کا دل خرق عادت کو قبول کرتا ہے۔ مگر جن کے دل بیمار ہیں وہ اس پتھر کے بھاگنے کی یہ تاویل بھی کرتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کسی اوپر جگہ میں کسی چشمہ میں غسل کرنے لگے۔ پتھر پر کپڑے رکھے اور پتھر لڑھک کر نیچے گر گیا۔ اب موسیٰ علیہ السلام کو مجبوراً نیچے آنا پڑا۔ وہاں اتفاقاً بنی اسرائیل بھی آنکلے۔

اور پتھر کو مارنے کا یہ مطلب ہے کہ اس کو لڑھکاتے ہوئے لاٹھی مار کر روک لیا۔ اور جن کے دل زیادہ بیمار ہیں وہ ذرا آگے بڑھ کر "حجر" کو "حا" کے کسرہ سے پڑھتے ہیں جس کے معنے گھوڑی کے ہیں یعنی گھوڑی پر کپڑے رکھے اور وہ بھاگ گئی۔

پھر زیادہ سے زیادہ اس میں یہی بات ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا ننگے بدن پہنچنا ٹھیک نہیں مگر حدیث میں یہ تصریح نہیں کہ بالکل ننگے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ کپڑا باندھ کر غسل کر رہے ہوں اور کپڑا بھیگ کر بدن پر لگ گیا ہو۔ جس سے بادنمایہ کی نفی کا یقین دیکھنے والے کو ہو سکتا ہے۔

تنبیہ

قرآن میں نمل (چیونٹی) یا ہدہد کی باتوں کا ذکر آتا ہے تو وہاں بعید بعید تاویلیں شروع کر کے اپنی تسلی کر لیتے ہیں۔ حیوان کو انسان بنانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے مگر حدیث پر محض اس لیے اعتراض کرتے ہیں کہ وہ غیر قرآن ہے۔ یہ بے انصافی ہے۔

دسویں حدیث قابل اعتراض

"حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسا جادو کیا گیا تھا کہ آپ خیال کرتے تھے کہ میں نے فلاں کام کر لیا ہے حالانکہ وہ کام نہیں کیا ہوتا تھا" (بخاری شریف جلد دوم)

فرمائیے کہ حضور کے متعلق یہ کس طرح باور کر لیا جائے کہ آپ پر معاذ اللہ!

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جادو کا اثر ہو گیا تھا کہ یہ بھی (مثلاً) یاد نہیں رہتا تھا کہ میں نے نماز پڑھ لی ہے یا نہیں ...." (مقام حدیث ج ۱ ص ۲۷۹)

جواب:- حدیث کے ترجمہ میں اپنی عادت کے مطابق کچھ تبدیلی کی ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں یخیل الیہ انہ یفعل الشیء وما فعلہ (بخاری جلد دوم)

حدیث میں پہلا صیغہ مضارع کا ہے جس کا معنی یہ ہے کہ آپ خیال کرتے ہیں کہ ایک کام کر سکتے ہیں یا کر سکیں گے اور یہ لفظ مرد و عورت کے تعلق سے کنایہ ہے۔ اس کا لغوی معنی مراد نہیں بلکہ کنائی معنی مراد ہے جیسا کہ بخاری میں اس کے بعد دوسرے باب میں اسی حدیث میں یہ لفظ (انہ یاتی النساء ولا یاتیھن) وارد ہے۔ زن و شوہر کے تعلق میں اپنے آپ کو پہلے کی طرح خیال کرتے مگر حقیقت میں قادر نہیں تھے۔ یعنی حقیقت کے خلاف خیال آجاتا جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کو بھی جادوگروں کے جادو سے یہ خیال آتا تھا کہ وہ رسیاں اور لاٹھیاں دوڑ رہی ہیں یُخَیَّلُ اِلَیْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰی (طٰہٰ) ان کے جادو سے موسیٰ علیہ السلام کو خیال آتا ہے کہ وہ دوڑ رہی ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں وہ نہیں دوڑ رہی تھیں۔

اس حدیث میں تین چیزیں قابل غور ہیں:-

۱- آپ پر جادو کیا گیا۔

۲- جادو کی حقیقت یہ ہے کہ شیاطین کے توسط سے یا اپنی قوت ارادی سے دوسرے پر اثر ڈالنے کی کوشش کی جاوے۔

۳- آنحضرت ﷺ پر اس کا اثر ہوا۔

۱- پہلی بات کہ کوئی شخص یہ کام کرے۔ یہ نبی کی شان کے خلاف نہیں۔

۲- دوسری بات کہ جادو کی حقیقت یہ ہے جس کا ذکر ہوا ہے۔ یہ بھی کوئی عجیب چیز نہیں

۳- نبی کا متاثر ہونا قرآن سے ثابت ہے۔ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے خیال پر جو اثر ہوا اس کا ذکر قرآن سے مذکور ہے۔ یہی اثر آنحضرت ﷺ پر ہوا کہ آپ کو خیال آتا کہ میری طاقت اسی طرح ہے مگر اس قدر طاقت نہ تھی۔ یا یہ خیال آتا ہو کہ مجھے اس طاقت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے زیادہ طاقت ہے مگر اتنی طاقت نہ ہو۔ اس خیال کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ جب اس شخص نے شیطان کی مدد سے آپ پر اثر ڈالنے کی کوشش کی مگر اس کا اثر نہ ہوا مگر بوجہ لطافت طبع کے یہ خیال گزرتا تھا کہ مجھے کوئی تکلیف دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس بنا پر کہ خیال منتشر ہے۔ قوتِ باہ پر اثر پڑ گیا ہو۔ یعنی اس خیال سے وقتی طور پر کمی پائی جاتی ہو اور اس کمی کو آپ محسوس نہ کرتے ہوں کیوں کہ یہ کمی حقیقت کے لحاظ سے نہ تھی بلکہ طبیعت کی تشویش کی بنا پر تھی۔ اس صورت میں اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ پہ جادو کا اثر ہو گیا تھا بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ پر جادو کیا گیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ کی طبیعت نے اس کو محسوس کیا اور اس احساس کی بنا پر تشویش پیدا ہوئی وقتی طور پر اس تشویش کی وجہ سے قوتِ باہ میں کمی پائی گئی۔ حقیقت میں وہ کمی نہیں تھی۔ حدیث میں جو اثرات ذکر ہوئے ہیں۔ سب اسی تشویش کا نتیجہ ہیں نہ کہ جادو سے متاثر ہونے کا۔

یہ ہیں ان لوگوں کے اعتراضات جو محض اس بنا پر کر رہے ہیں کہ حدیث کو نہیں مانتے اور اسی وجہ سے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے مَالِ هٰؤُلَاۗءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا (اس قوم کو کیا ہوا کہ حدیث) بات بالکل نہیں سمجھتے۔ (نساء)

غالباً اسی قسم کے اشکالات ہوں گے جن کا ذکر مولوی عبید اللہ سندھی نے کیا ہے۔

"بخاری میں میرے اشکالات کیا ہیں اور میں ایک یورپین نو مسلم کو وہ کتاب کیوں نہیں پڑھا سکتا ان تفاصیل پر میں مجالسِ عامہ میں گفتگو کرنے کا روادار نہیں" (الفرقان ص ۲۸۵ تا ۲۸۷۔) مقام حدیث ص۲۸۰

اس میں کوئی شبہ نہیں ہر بات ہر مجلس کے عین مناسب نہیں ہوتی اور نہ ہر انسان کے حال کے موافق ہوتی ہو۔ خواہ قرآن میں ہو یا حدیث میں۔ کیونکہ بیان کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ مجلس کا بھی لحاظ رکھے اور مخاطب کو بھی دیکھے۔ پس عورتوں کی باتیں اگرچہ قرآن میں مذکور ہیں لیکن بے حجابانہ شکل میں کسی عورت کے سامنے بیان ذکر ضرورت سے وقت بصورت مسئلہ ہذا بانہ شکل میں بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

یہی حال حدیثوں کا ہے جو حصہ ان میں دین کا ہے ضرورت کے وقت اس کے

© rasailojaraid:com

© rasailojaraid.com

بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں اور جو حصہ ان میں دین کا نہیں، دین کے متعلق اس کے بیان کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

پس جو حدیثیں اس قسم کی ہوں کہ آپ نے بتقاضاء وقت ان کا ذکر کیا ہو ان کے متعلق کسی بھی حدیث کے ماننے والے کے نزدیک یہ اعتقاد نہیں کہ وہ دائمی ہیں مگر اس امر کے لیے ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے اور وقتی حدیثوں کے وقتی ہونے کے بارے میں شواہد بھی مل جاتے ہیں۔

یہ بحث تو ان لوگوں کے لیے مفید ہے جو حدیث کو حجت سمجھتے ہوں اور ان میں وقتی اور غیر وقتی ہونے کے قائل ہوں مگر جو شخص تمام ذخیرہ حدیث کو وقتی خیال کرتا ہو اس کو اس بحث سے کیا مطلب کہ یہ حدیث وقتی ہے یا دائمی۔ حدیث کے پرکھنے کے لیے منکرین حدیث کبھی یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ قرآن کو معیار بنایا جائے مگر اس معیار سے حدیث پر کیا اثر پڑے گا۔ حدیث تو ٹھہری وقتی۔ اگر قرآن کے مطابق ہو تو وہاں حدیث کی ضرورت ہی نہیں۔ اگر خلاف ہو تو حدیث ہی نہ ہوئی۔ اور جو حدیثیں بظاہر قرآن کے خلاف بلکہ قرآن کے اصول کو بہ تقاضا زمانہ خاص وقتی طور پر ذکر ہوئی ہیں وہ دین کا حصہ ہی نہیں۔ پھر ان میں سے منکرین حدیث کے خیال کے مطابق بھی یقینی طور پر صحیح نہیں۔ وہاں صحت کا معیار کیا ہو گا پھر ساری جد و جہد بے کار اور فضول ٹھہرے گی۔

© rasailojaraid.com